حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لُدھیانوی

متحدہ پنجاب کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا تعلق لدھیانہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو نسلوں اور پشتوں سے اپنے علم و فضل اور دین و دیانت، خدمت خلق، خدمت دین، مجاہدانہ سرفروشی اور عزیمت و بلند ہمتی میں ممتاز اور اپنی ان صفات کی وجہ سے مرجع انام تھا، ان کے آبا و اجداد میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا محمد صاحب مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ یہ حضرات ہندوستان میں انگریزی سامراج کے ابتدائی مخالفوں میں سے تھے اور انھیں کی یہ خصوصیت تھی کہ مرزا قادیانی کے دعاوی باطلہ کا صحیح دینی روشنی میں ان بزرگوں نے تجزیہ فرمایا، اس کے فتنۂ عظیم کا مقابلہ اور اسلام کے تقاضوں سے اس پر کفر کا فتوٰی نافذ فرمایا، انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے جواز پر بھی ۵۰۰ علمائے امت کا مشہور فتوٰی بھی انھیں حضرات نے مرتب اور شائع کیا تھا۔ یہ ۵۰۰ علماء کا فتوٰی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے، افسوس کہ فرقہ واریت کے شدید غلبہ نے اس کی اہمیت کے سمجھنے کا موقع نہیں دیا، یہ لوگ تو مولانا حبیب الرحمان کے آبا و اجداد تھے، ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ایک قلندر صفت رچے بسے ہوئے بزرگ پختہ عالم درویش صفت انسان، بزرگوں اور علماء کے ہمنشیں اور بڑے بڑے وزراء و حکامان وقت پر اپنے دینی دبدبہ کے ساتھ مؤثر تھے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا محمد زکریا صاحب جمعہ کے دن محلہ موچپورہ سے

اپنے گھر سے کمپنی باغ کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے تشریف لاتے تھے، تو راستے میں کئی بازاروں کے دوکاندار اس خوف سے اپنی دوکانیں بند کر لیتے تھے کہ مولانا ادھر سے گذریں گے اگر نماز جمعہ کے قریب وقت میں ہماری دوکانیں کھلی ہوئی پائیں گے تو خفا ہوں گے۔ حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ الہند، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبدالقادر لاہوری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ والے مولانا نور احمد صاحب پسروری، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سر محمد اقبال، حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے سینکڑوں علماء اور فضلاء ان کے یا ہمعصر تھے یا ان کے بزرگ اور پیش رو، اور یہ پورا طبقہ ان کا ادب واحترام کرتا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی میں ان کا خاندان مولانا عبدالرشید مرحوم، عبدالحمید صاحب مرحوم، مفتی ضیاء الحسن صاحب لدھیانوی، مفتی عبدالحمید اور دوسرے بیسیوں حضرات ان کے ہمعصر تھے یا ان کے چھوٹے علم و فضل کے اس لہلہاتے باغ میں مولانا حبیب الرحمٰن ایک سدابہار پھول کی طرح آنکھ کھولی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل ہوئی اور پھر ابتدائی عمر میں مرکز علمی دارالعلوم میں تشریف لے آئے، یہاں انھیں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تربیت اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کا فیضان التفات حاصل رہا۔ ممتاز اساتذہ وقت کی رہنمائی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بڑی محنت کے ساتھ دینی علوم حاصل کئے۔

۱۹۱۲ء میں تحریک خلافت میں مولانا پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے یہیں سے

ان کی مجاہدانہ دینی وسیاسی زندگی کا آغاز ہوا - ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۵ء تک کم و بیش چالیس سال نہ صرف متحدہ پنجاب بلکہ پورا ہندوستان ان کے نفس گرم تگ و دوے پیہم، یقین محکم، اخلاص کامل، خدمت خلق اور شعلہ بار تقریروں سے گونجتا رہا، وہ تحریک خلافت کے جانباز سپاہی، کانگریس کے سرگرم کارکن، مجلس احرار کے روح رواں، اسلامی مدارس کے مشیر، اور خیر خواہ، اپنے نصب العین کے وفادار، اپنے ساتھیوں کے غم گسار، تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے کراچی کانگریس میں وہ نمایاں تھے، ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جارہے تھے تو مولانا مرحوم، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق کے ساتھ بمبئی کے ساحل پر گاندھی کو الوداع کہہ رہے تھے۔

تحریک کشمیر نے ان کے دم سے جنم لیا، انگریزی زمانہ کی ریاستوں میں عوام کو حق خود اختیاری دلوانے کے سلسلے میں مولانا کی بڑی خدمات ہیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے تعاون سے انھوں نے قادیانی تحریک کے استیصال کے سلسلے میں ہمہ گیر جدوجہد فرمائی۔ تبلیغ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جس پر مولانا نے کوئی توجہ نہ فرمائی ہو۔

مولانا کی جامع شخصیت

مولانا حبیب الرحمٰن کی بڑی شخصیت یہ تھی کہ اللہ کریم نے علم وفضل اخلاق، اعمال، تہذیب وسیاست، استغنا و توکل، فہم و فراست، خدمت دین، شغف قرآن کریم، تصوف و طریقت میں انھیں جامعیت نصیب فرمائی تھی، اسلامی مدارس میں پہنچ کر وہ علماء و فضلاء کے درمیان ایک دبدبہ والے عالم نظر آتے تھے اور مسائل علمیہ وفقہیہ کی

تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خانقاہوں میں پہنچ کر ذکر و شغل، مراقبہ ذلت اور تزکیۂ نفس پر ان کی نظر رہتی، دارالمصنفین اعظم گڈھ اور ندوۃ المصنفین دہلی میں پہنچ کر علمی اور تاریخی انکشافات سے انھیں دلچسپی ہوتی، اپنے گھر پر ہوتے تو علی الصباح اپنے سب مہمانوں اور بچوں کو جمع کر کے قرآن شریف کی تلاوت اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر پابندی سے تفسیر قرآن پڑھاتے، شاہ صاحب دہلوی کے ترجمہ سے انھیں بڑی دلچسپی تھی، اس ترجمے کے دسیوں ایڈیشن انھوں نے جمع فرمائے تھے، اور انھیں اچھی طرح یاد تھا کہ فلاں آیت قرآنی اور فلاں لفظ کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین دہلوی نے کس طرح اس مفہوم کو ادا کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی نے کیا لفظ اختیار کئے ہیں۔

تراجم قرآنی سے انھیں دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انتقال سے تین ماہ پہلے دفتر رسالہ دارالعلوم دیوبند میں میرے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا کہ سید محبوب رضوی کو بلاؤ، سید صاحب آئے تو تراجم قرآن پر ان کے ایک مضمون پر تفصیلی گفتگو فرمائی اور ہدایت فرمائی کہ شاہ عبدالقادر کے متعدد نسخے سامنے رکھ کر ایک زائد سے زائد قابل اعتماد ترجمہ مرتب کریں میں اپنی کوشش سے اسے چھاپ دوں گا۔ افسوس ہے کہ اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا کا انتقال ہو گیا اور ان کی یہ ہدایت پوری نہ ہو سکی جس پر میرے محترم رفیق جناب سید محبوب رضوی کو آج تک ملال ہے۔

مولانا لدھیانہ اور دہلی میں ہر روز اپنے محلہ کا گشت فرماتے، ہر ہندو اور مسلم پڑوسی سے علیک سلیک اور مزاج پرسی کرتے اور جس کو جو ضرورت ہوتی بے اختیار توجہ فرماتے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات، جیل کی زندگی میں ساتھیوں کی خدمت، بیمار ساتھیوں کی تیمارداری ان کا خاص موضوع تھا،

ان کی زندگی میں، میں یا میری والدہ محترمہ جب بھی بیمار ہوئے تو مولانا اصرار کے ساتھ ہمیں لدھیانہ بلا کر مہینوں ہمارے علاج اور پرہیزی کھانے کا بار اٹھاتے، ایک مرتبہ میری والدہ صاحبہ کو بلا کر ڈیڑھ سال تک لدھیانہ رکھا، مہینوں ان کے قیام کے لئے الگ مکان اور ان کی کل ضروریات کا تکفل فرمایا۔ میرے بزرگ مولانا سید محمد ادریس سکھروڈی جو والد محترم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے خادم خاص ہونے کے لحاظ سے حلقۂ انوری کے مخدوم تھے، دہلی میں بیمار ہو گئے تو مولانا انھیں اپنے گھر اٹھا لے گئے اور مہینوں ان کی خدمت کی۔

مولانا کی ۷۰ سال کی زندگی اور سیکڑوں واقعات میرے حافظہ میں ہیں کون کون سا واقعہ لکھوں اور کس کس کو چھوڑ دوں۔ ۱۹۴۶ء میں میرے برادر مولانا سید انظر شاہ سلمہٗ مدرسہ فتحپوری دہلی کے طالب علم تھے، اردو بازار میں حضرت مولانا کی نظر ان پر پڑی فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے شام کو مجھ سے احرار کے دفتر میں مل لینا کچھ مل گیا تو تمہیں دیدوں گا، اور شام کو عزیز موصوف ملے تو دس پندرہ روپے اصرار کے ساتھ ان کی جیب میں ڈالدیئے، سخاوت و فیاضی یہ عالم تھا کہ دسیوں ایسے واقعات میرے حافظہ میں ہیں۔ ان کا کوئی دوست ان سے ملنے آیا، مولانا اسے ضرورتمند سمجھتے ہیں، جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو دروازے تک اسے پہنچانے آئے، خاموشی سے کچھ رقم اس کے حوالہ کر دی۔

جرأت و بیباکی، صاف بیانی میں اپنی مثال آپ تھے، گاندھی جی، جواہر لال اور مولانا آزاد دل سے ان کی قدر فرماتے تھے، ان کے مشوروں کو گوش ہوش سے سنتے تھے اور مولانا بے دھڑک اپنے دل کی بات ان سے کہہ دیتے اور ان کی سرگرمیوں پر انھیں ٹوکتے تھے، بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں جب بم کا حادثہ پیش آیا تو مولانا مرحوم دوسرے روز گاندھی جی سے ملے اور فرمایا کہ اب اس واقعہ کے بعد آپ کی

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، یا تو اپنی ان سبھاؤں کو ختم کر دیا مرنے کے لئے تیار رہو، گاندھی جی نے کہا کہ مولانا صاحب مجھے مرنا منظور ہے، لیکن جو بات میرے ذہن میں ہے اسے چھپا نہیں سکتا چنانچہ اس پکے ارادے کے آدمی نے موت قبول کی مگر فرقہ واریت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

مولانا مرحوم نے گاندھی جی کو اپنے استاذ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے ملنے پر بھی تیار فرمایا تھا، مگر گاندھی جی ۳۳ء میں گول میز کانفرنس لندن میں تھے کہ حضرت علامہ کا انتقال ہو گیا اور یہ تجویز سامنے نہ آسکی مولانا دو بڑوں کو باہم ملاتے، چھوٹوں کی علمی تہذیبی تربیت فرماتے اور ہر شخص کے مناسب مزاج کام میں لگا دینے کا ملکہ تھا۔ حضرت مولانا تھانوی کے سیاسی مسلک سے مولانا اختلاف فرماتے تھے مگر گاہ بگاہ پوری نیازمندی کے ساتھ حضرت مولانا تھانوی کے یہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ساتھ لے کر حاضری دیتے تھے، شاہ صاحب بخاری کی طرف حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کو متوجہ فرمانے کا سہرا بھی مولانا ہی کے سر تھا، پنجاب کے متعدد سفروں میں وہ حضرت شاہ صاحب بخاری کو ساتھ لے کر حضرت مولانا انور شاہ کے ساتھ رہے اور بار بار شاہ صاحب بخاری کو لے کر علامہ کے یہاں مقیم اور ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے کئی دفعہ میرے سامنے شاہ صاحب بخاری سے فرمایا کہ ان کی (حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی) باتیں غور سے سن لے، عمر بھر تیرے کام آئیں گی۔

حضرت علامہ انور شاہ مولانا سے ان کے گھر، ان کی اولاد، اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور خاندان سے یہ واقعہ ہے کہ علامہ انور شاہ وقار و تمکنت کے ایک کوہ گراں بار تھے ہر کہہ و مہ سے ان کا بے تکلف ہونا امر دشوار تھا اور نہ زندگی کے عام

معاملات سے ان کا کوئی رابطہ تھا مگر مولانا سے ان کی محبت یہ تھی کہ جس زمانہ میں مولانا حبیب الرحمن ملتان جیل میں قید تھے حضرت علامہ بغیر کسی اطلاع کے لدھیانہ ان کے گھر پہنچ گئے، گھر پہنچنے پر مردانہ میں جھاڑو لگی ہوئی تھی اور نہ فرش بچھا ہوا تھا، حضرت علامہ نے گھر میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ مرحومہ اور ان کی بچیوں کو کہلوایا کہ جھاڑو اور فرش بھیجدو، اور جھاڑو آگئی تو اپنے خدام سے فرمایا کہ بھائی جھاڑو دو، فرش بچھاؤ، یہ اپنا گھر ہے یہاں کسی بات کا تکلف نہیں، گھر میں کون ہے جو باہر آکر ہمارے بیٹھنے کی جگہ بنائے گا؟ خود اپنا گھر سمجھو۔ میری نظر میں آج بھی وہ منظر محفوظ ہے کہ ۳۳ء میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمان جیل سے رہا ہوئے تو مولانا انھیں لے کر دیوبند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، آمنا سامنا ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت یہ خلیل الرحمان ہے، ابھی چند روز ہوئے سال بھر کی سزا جیل سے کاٹ کر آیا ہے۔ حضرت علامہ نے بڑی شفقت کے ساتھ خلیل الرحمن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، کیوں بھائی خلیل الرحمان! یہ واقعہ یاد ہے، لاؤ اپنا سر اور پیشانی مجھے دو جس پیشانی پر علامہ انور شاہ کا بوسہ ثبت ہے اسے کم سے کم غور سے دیکھ لوں اور اس کی زیارت کر لوں۔

مولانا کی زندگی کی دو حقیقتیں اور قابل ذکر ہیں، ایک سیاسیات میں ان کی دیدہ وری، ذہانت، معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت اور پس وپیش کو دیکھ کر ایک پختہ رائے قائم کرنے کی عادت، وہ تیسوں برس بعد پیش آنے والے حالات وتغیرات کی بو پہلے پالیتے اور فرماتے کہ آئندہ چل کر ایسا ہوگا، اور ایک نہیں کئی معاملوں میں تجربہ ہوا کہ انھوں نے جو سوچا تھا وہ صحیح تھا،

تقسیم ملک سے پہلے بار بار انھوں نے فرمایا کہ ملک کا بٹوارہ مسلمانوں

کے لئے دونوں ملکوں میں مضر ہوگا، مسلمان اس طرح ہل ہل جائیں گے کہ انھیں اپنا وجود باقی رکھنا مشکل ہوجائے گا، اسی احساس کے پیش نظر انھوں نے نیشلسٹ مسلمانوں کی صف اول کی قیادت فرمائی اور تقسیم کو رد کرنے کے لئے تقسیم کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کے بپھرے ہوئے ہجوموں اور مجمعوں کے تشدد کا شکار بنتے رہے۔

لدھیانہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ صدیوں کی گہری مقبولیت کے باوجود لیگی طبقہ نے ان کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ مولانا تقسیم ملک کے جو نتائج سوچتے تھے افسوس ہے کہ وہ بعد میں حرف بحرف پورے ہوئے، ۵۴ء میں کشمیر کے اندرونی مسائل کے جھگڑے شروع ہو گئے، مولانا کسی حد تک ان لوگوں کو پسند فرماتے تھے جو اس وقت کشمیر میں برسراقتدار تھے، مولانا کو معلوم ہوا کہ مجھے کشمیر کے اس حلقے سے ہمدردی ہے جو اس وقت برسراقتدار تھا، مولانا نے ایک گفتگو میں مجھے کشمیر کے سبھی سیاسی لیڈروں کے ماضی اور حال سے واقف کرایا اور فرمایا کہ تم جس طرح سوچتے ہو بات اس طرح نہیں کشمیر میں یہ کوئی اصولی سیاست کا تنازعہ نہیں بلکہ ذاتی اقتدار کی جنگ ہے بعد کے حالات نے مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور کردیا۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ اپنے مذہبی عقائد اور سیاسی خیالات میں پختہ تھے مگر دوسرے خیالات کے لوگوں سے کھل کر ملتے اور ان سے شفقت آمیز تعلقات رکھتے تھے، یہ ہی وجہ تھی کہ بہت سے خیالات کے افراد ان کے ارد گرد جمع ہوتے، سیاسی بحث و مباحثے بھی ہوتے اور مذہبی مسائل پر اظہار خیال بھی، مولانا بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے مگر دوسروں کے خیالات بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ سنتے اور ان کی تردید میں ایسا انداز اختیار نہ فرماتے تھے کہ ذاتی طور پر ان لوگوں کی دل شکنی ہوتی ہو مولانا کی ذات اور ان کا گھر سلجھے ہوئے شریف لوگوں، قومی کارکنوں،

پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران، اخبار کے ایڈیٹروں، کالجوں کے پروفیسروں دینی مدارس کے علماء، شعراء اور ادبا کا مرکز تھا، سیاسیات سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگوں نے ان کی خدمت میں صرف اس لئے حاضری دی کہ ان کے اشارات کی روشنی میں اپنے خیالات مرتب کریں۔

مولانا کے جاننے والے اور ان کے ہزاروں عقیدتمند دل نے ان کے انتقال پر ۱۵۔ ۲۰ برس گذر جانے کے باوجود آج تک نہیں بھولے، اور سچ یہ ہے کہ وہ اتنی قیمتی زندگی رکھتے تھے کہ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مولانا کے صاحبزادگان جو دہلی اور مشرقی پنجاب میں منقسم ہیں، اچھے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، مولانا کی قبر جامع دہلی کے شمالی رخ پر ایک مختصر سے قبرستان میں ہے، پچھلے برس میں ان کے مزار پر حاضر ہوا، ایصال ثواب کیا اور پھر دیر تک سوچتا رہا کہ کتنی بڑی زندگی کیا نکھرا ہوا اخلاق، کتنا مضبوط کیرکٹر اور کیسی بے مثال فراست اس گوشۂ قبر میں آسودۂ راحت ہے ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے